

میں تو مجھے سوچ بچار کا موقع ملا ہے... بھڑکتے ہوئے جذبات کی آگ سرد ہوئی ہے تو میں راکھ کریدنے کے قابل ہوا ہوں.. اور یوں میرے اندر ایک تصور کی جو ناقابل تردید تصور یہ موجود تھی، اس کی تردید ہونے لگی ہے.. اس میں دراڑیں پڑنے لگی ہیں..”

”تم بھٹک گئے ہو جانی.. راہ راست سے ہٹ گئے ہو۔“ ہاشم میر کے اندر بھی ایسے بے شمار شک ایک عرصے سے بیسرا کرتے تھے لیکن وہ جان بوجھ کر ان کی جانب دھیان نہ دیتا تھا اور اب جب کہ جانی انہی کاظہار کر رہا تھا، وہ خوفزدہ ہو گیا تھا اور اپنے آپ کو ڈھار س دینے کی خاطروہ غرایا۔ ”موت سے ڈرتے ہو؟“

”ذریں اس شے سے جاتا ہے جو ناگہانی اور یکدم ہو.. میں تو جانتا ہوں کہ میں یقینی طور پر اس کائنات میں چند لمحوں کا مہمان ہوں اور میں یقینی طور پر زندہ نہیں رہوں گا.. لیکن میرے اندر شکوک ہیں ہاشم میر.. پہلے نہیں تھے، اب ہیں کہ میرا وجود تہذیب کے ارتقاء کو روک کر پھر کے زمانے تک واپس لے جانے میں معاون تو نہیں ثابت ہو رہا.. محض ان کی بظاہر پارسائی اور نیکی اور نیت کا کھرا پن کہیں مجھے بھٹکا تو نہیں رہا.. یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اسلام کی جو توجیہ وہ کر رہے ہیں، صرف وہی درست ہو اوزبقیہ دنیا کے سارے مسلمان راہ راست پر نہ ہوں.. کیا ایسا تو نہیں کہ انہوں نے اپنی کم علمی اور تعصب.. جس پر انہیں اختیار نہیں.. کے باعث اس عظیم دین کو تقویت دینے کی بجائے ضعف پہنچایا ہو.. مجھے پہلے شک تھا اور اب یقین ہے کہ انہوں نے یہی کیا ہے..“

”جانی..“ بیگ نے اس کے کندھے پر ایک بلکل سی تھکی دی لیکن بد قسمتی سے اس تھکی کے نیچے وہ گولی آگئی جو جانی کے کندھے میں قندوز میں گئی تھی اور ابھی تک وہیں ٹھہری ہوئی تھی.. اور وہ زور زور سے کراہنے لگا..

”سوری جانی.. سوری“ بیگ نے دونوں ہاتھ اوپر کر دیئے۔ ”ویکھو

جانی، اب طالبان کو بھول جاؤ کہ وہ کیا تھے اور کیوں تھے.. وہ ہمیں ایک فاصلے سے بہت کامل لگتے تھے اور ہم پر بھی تصور کا خواب چھایا ہوا تھا اور ہم چلے آئے.. ہم اب اس ساعت میں طالبان کا دفاع نہیں کر رہے.. اپنا دفاع کر رہے ہیں.. طالبان تو پہلے بھی محض ایک بہانہ تھے.. جانی، انسانی تاریخ ذاتی بہانوں سے بھری پڑی ہے... صلیبی جنگیں کیا تھیں.. ہر ایک کا انفرادی بہانہ تھا اور تمہارے والد کا کمیونزم کیا تھا.. بہت سے انفرادی تعصب اور خواب تھے جو یکجا ہوئے.. اور پورے نہ ہوئے..”

”یارا.. تم لوگ جب اس طرح کا اونچا اونچا بات کرتے ہو تو ہمارا سمجھ میں نہیں آتا..“ گل شیر اتنی طویل باقی میں سنتا سنتا جھلا گیا تھا۔ ”یارا ہم تو یہ جانتا ہے کہ ہم ادھر جان دینے کو.. شہید ہونے کو آیا ہے تو ہو جائے گا، اس میں کیا جھگڑا ممکنا ہے.. جہاد پر آگیا تو کیا تقریر کرتا ہے.. سوال کیا پوچھتا ہے.. ادھر شہید ہو جائے..“

”ہاں...“ جانی بولا... اس نے گل شیر کی سنی ان سنی کر دی۔ ”ہم یہاں اپنا دفاع کر رہے ہیں، تم ٹھیک کہتے ہو...“

اوپر قلعہ جنگی کی دو پہر میں کتے نہیں تھے..  
یہ انسانی قدموں کی چاپ تھی اور آواز تھی..  
ہاں وہاں کچھ لوگ تھے..

بُو سے بھری ہوا کے دوش پر جو تھہ خانے میں اترتی تھی، سوار بھی فارسی کا کوئی فقرہ ان تک رُک کر آ جاتا اور ایک بار امریکی لمحے کی لکھتی انگریزی ان کے کانوں میں پہنچی..

اوپر لوگ تھے..  
وہ یہاں کیا کرنے آگئے تھے...  
.

چی پچی بہت مھم سرگوشی میں جیسے اپنے آپ سے کہنے لگا۔ ”یہ جان کئے ہیں کہ ہم یہاں ہیں.. انہیں کسی نہ کسی طرح علم ہو گیا ہے کہ ہم یہاں ابھی تک زندہ ہیں.. اپنے ہتھیار سنجا لو.. ہمارے پاس صرف تین کلاشکوفیں ہیں.. گولیاں بہت ہیں.. کسی کی انگلی میں کچھ سکت ہے کہ لبی دبا سکے.. یہ کسی بھی لمحے نبچے آسکتے ہیں..“

وہ سب ایک ہی چند ہیادینے والے لمحے میں یکسر بھول گئے کہ وہ نیم مردہ حالت میں ہیں.. موت کی چوکھٹ پر ہیں.. سرد اور سخت گوبر اور اپنی ہی غلاظت میں لمحڑے ہوئے ہیں اور ان کے سامنے گھوڑے کے گوشت کے وہ لمحڑے ہیں جنہیں ان کے معدوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور وہ اس قابل نہیں کہ ایک کروٹ بھی بدل سکیں اور اس کے باوجود وہ سب ایک ہی چند ہیادینے والے لمحے میں چوکنے اور ہوشیار ہو گئے... ان کی تمام تر جسمیں متھر ک ہو گئیں.. ان کی نظریں پہلی سیرھی کی طرف اٹھی ہوئی تھیں جس پر اگر انہیں بوٹ دکھائی دیتے تو انی سکت جمع ہو گئی تھی کہ وہ اس پر فائز رک سکتے..

بہت دیر گزر گئی، اس چوکنی کیفیت میں لیکن پہلی سیرھی خالی ہی رہی.. لگتا تھا کہ اوپر جو لوگ ہیں محض تفریح کی خاطر چل پھر رہے ہیں.. سیر کر رہے ہیں.. کچھ دیر بعد ان کی آوازیں دور ہونے لگیں.. قدموں کی چاپ مھم ہو گئی.. انہیں شاید بھی نہ ہوا تھا کہ لاشوں کی اس بستی کے نیچے کوئی نہ مددہ سانس بھی ہو سکتا ہے..

”یارا میں پتے کرتا ہوں..“ گل شیر کہنوں کے زور پر اوپر ہوا، پیپ سے رستے زخموں سے چکلی شلوار کا پانچھہ اڑستا اٹھ بیٹھا اور پھر ایک ایسی ہمت کو بروئے کارلا کر جو اس کے ساتھیوں کے گمان میں بھی نہ تھی، سیرھیوں پر گھستنا اور پہنچ گیا.. ان سب کی آنکھیں کھلی تھیں اور گل شیر کو اس حیرت ناک

کارناٹے پر داد دیتی تھیں.. وہ نہ صرف اپنے وجود کو اوپر تک لے گیا تھا بلکہ کلاشکوف کے بھاری لوہے کو بھی گھینٹا ساتھ لے گیا تھا..

وہ پہلی سیرھی سے آگے نہیں گیا.. صرف اس کے پاؤں نظر آرہے تھے.. کئے پھٹے کپڑوں سے بھری دراڑوں والے پاؤں اور اس کا باقیہ دھڑ قلعہ جنگی کے صحن میں تھا..

کچھ دیر بعد وہ تقریباً لڑکتا ہوا تھہ خانے میں آگرا۔ ”یارا ادھر تو دوستم سیر کرتا ہے۔“

”دوستم؟..“ تقریباً سب نے جو بول سکتے تھے، یک زبان... ہو کر کہا۔

”گھنی ابر و وہ اور گھنگھریالے بالوں والا رشید دوستم؟“ ہاشم میر کی آواز میں ایک خفیف ساخوف تھا..

”ہاں یارا.. جو کبھی رو سیوں کے خلاف لڑتا تھا، اب ان کا ساتھ دے رہا ہے..“

”کیا تمہیں یقین ہے؟“

”میں نے اس کو پہچان لیا ہے یارا... وہی تھا.. اس کے ساتھ کچھ لوگ ہے.. سیر کرتا ہے خانہ خراب.. پہلے سوچا سے شوٹ کرتا ہے، پھر سوچا فائز کا ڈز مزن کر سب ادھر کو دوڑ آئے گا اور ہم سب خواہ مخواہ مارا جائے گا..“

”اوپر کیا کر رہا ہے..“

”سیر کرتا ہے ناں.. کبھی کسی لاش کے پاس رکتا ہے اور ٹھوکر لگاتا ہے اور کہتا ہے ”غیر ملکی“ اور آگے بڑھ جاتا ہے۔ ساتھ میں فوجی بھی ہے اور ایک گورا بھی ہے.. فوجی شلوار قمیض میں نہیں، روس کا دیا ہوا پتلون والا اور دی اور بڑا بوٹ میں ہے..“

”انہیں یقیناً شک ہے کہ ہم یہاں ہیں..“

”شک ہوتا تو ادھر آ جاتا.. سیر نہ کرتا..“

ان کی نظریں پہلے سیر ہمی پر چپک گئی تھیں، وہاں سے الگ نہ ہوتی تھیں.. وہیں پھر ہو گئی تھیں.. چونکے اور انتظار کرتے ہوئے.. کبھی ان کی آوازیں واضح ہونے لگتیں جو اور صحن میں چلتے تھے اور کبھی دور ہو جاتیں.. اور کبھی کوئی بھی چاپ نہ ہوتی..

وہ سب چونکے ہو گئے تھے سوائے اللہ بخش کے.. مُردوں کے چونکے ہو جانے کی روایت نہ تھی.. تہہ خانے کی کچھ چھت کو سہارتے پرانے سال خورده شہتیروں میں سے مٹی گرتی تھی.. وہ اس مٹی کو گرتے ہوئے دیکھ نہیں سکتے تھے، ہاں جب وہ چہرہ اور کر کے چھت کو دیکھتے تو مٹی کی ایک نامعلوم سی پھوار محسوس کرتے جیسے دھنڈ میں چہرے پر محسوس ہوتی ہے..

وہ ابھی تک اور پڑتھے.. چلتے پھرتے تھے..

جب کبھی وہ عین ان کے اوپر آتے تو ان کے قدموں کی دھمک سے چھت میں سے زیادہ مٹی گرنے لگتی۔

اگرچہ اور قلعہ جنگی کے صحن میں چلتے لوگوں کی چاپ.. جو شمن تھے.. کچھ اچھاشگون تو نہیں تھا لیکن بے شمار برسوں کے بعد.. بے شمار برس لگتے تھے۔ اگرچہ صرف چند روز تھے.. ان کے کان کسی اور انسان کی موجودگی سے آگاہ ہوئے تھے اور انہیں زندگی کے ہونے کی نویدی تھی.. بے شک اس میں ان کی موت کی قربت کی بھی اطلاع تھی لیکن اس کے باوجود وہ ذرا پُر جوش تھے اور ایک گھرے نیم مردہ انہاک کے ساتھ کان لگا کر اس چاپ کو سنتے تھے..

”میں کچھ بولوں تو یارا آپ براؤ نہیں منائے گا..“ گل شیر نے سوال کیا اور جواب کا انتظار کئے بغیر کہنے لگا۔ ”مجھ میں ابھی اتنا طاقت ہے کہ دوبارہ اور جاؤں.. اور ان خانہ خرابوں کو جا کر بولوں کہ یارا کیا ادھر ادھر سیر کرتا پھرتا ہے..“

ادھر آؤ اور سارا معاملہ ختم کرو.. ہم کو شوی سے اتار دو.. بول دوں؟“ کوئی نہ بولا۔  
”تو ان کو بولتا ہوں کہ ہم اپنا تین ہتھیار تمہارے حوالے کرتا ہے.. ہم کو اپنا گھر  
جانے دو۔“

”وہ ہمیں اپنے گھر نہیں جانے دیں گے..“

”کیا پتہ ان کے دل میں نرمی آجائے..“

”ہتھیار ڈال کر بے غیرت نہیں ہونا خان صاحب.. کیسے خان ہو..“

”یارا پہلے بھی تو ڈالا تھا.. مزار شریف میں اب دوبارہ ڈال دیئے تو کیا

حرج ہے؟“

”پہلے ڈالا تھا تو کیا ہوا تھا.. اب بھی وہی ہو گا.. بھیڑ بکری کی طرح

نہیں مرننا خان صاحب.. ادھر یہ تھہ خانہ مناسب قبر ہے.. اوپر مٹی تو ہے... صحن

میں جو پڑے ہیں، ان پر تو مٹی بھی نہیں ہے..“

”یہ کون بات کرتا ہے.. پچی پچی... وہاب... کون ہاشم... یارا جو بھی

بات کرتا ہے، ذرا غور سے سنے.. ہم تو مسخری کرتا تھا... کون کافر کا بچہ ہتھیار

ڈالے گا.. یارا گفتگو کر کہ ہتھیار کتنا ہے.. نہیں گتنی کا ضرورت نہیں تین ہے..

ایک میرے پاس ہے، باقی دو کھدھر ہے؟“

”ایک میرے پاس ہے گل شیر۔“ بیگ نے اطلاع کی۔

”اور ایک میرا خیال ہے کہ میرے پاس ہے..“ جانی مشکل سے بولا۔

جب سے بیگ نے اسے تسلی دینے کی خاطر اس کا کندھا تھپکا تھا تو اس میں ٹھہری

ہوئی قندوز کی گولی اپنے مقام سے ذرا اہل گئی تھی اور بہت اذیت دیتی تھی۔ ”ہاں

میرے پاس ہے تو پر اس گھوڑے کے ڈھانچے کے نیچے دلبی ہوئی ہے.. یہ زندہ

ہوتا تو اسے درخواست کرتا کہ پونی ڈیزِ ذرا کھک جاؤ.. لیکن میں اسے کھینچ کر

نکال لوں گا..“

”یہ تین کی گنتی مکمل ہو گیا؟.. میں... بیگ اور جانی..“

جیسے ایک اپنچھٹے کا عادی ہو جاتا ہے..

کینسر کا ایک مریض بے پناہ... بدن کے ہر مویں کچو کے دیتی اذیت کو برداشت کرتا چلا جاتا ہے کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں.. اور وہ بے حد نارمل انداز میں جیسے وہ عام زندگی میں ہے.. صحت مند اور تو انہے.. روزمرہ کی باقی میں کرتا چلا جاتا ہے..

جیسے ایک نایبنا مجبوراً انڈھیرے سے سمجھوتہ کر لیتا ہے، بالکل ایسے وہ اپنے اپنے پیپ بھرے سیپیٹک ہوتے زخموں اور بدن میں آہنی کر چیزوں اور ٹھہر پچکی گولیوں سے سمجھوتہ کر چکے تھے..

ویسے سمجھوتے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اس سے اذیت کم ہو جاتی ہے۔ لیکن روزمرہ کی باتوں میں خلل نہیں آتا..

ان کے جتنے بھی دن اس تاریک زیریز میں قبر نما تھہ خانے میں گزرے تھے تو یہ ایک پکنک تونہ تھے لیکن اس دوران وہ ایک دوسرے سے آگاہ ہوئے تھے.. اتنے قریب آگئے تھے جیسے ایک ہی ماں کی کوکھ سے جنم لیا ہو.. اکٹھے یہیں اسی تھہ خانے میں پلے بڑھے ہوں.. بچپن کے بعد جوانی بھی یہیں گزاری اور اب... موت کی منتظری بھی یہیں تھی.. کہ اب.. بلکہ آج.. اوپر جو قدموں کی آواز تھی، وہ گویا جدائی کا بلا و اتحا جود ستک دیتا تھا..

یہ جدائی آخری اور مکمل ہونی تھی..

وہ اسی سمجھوتے کی کیفیت میں لاچا راسی آخری جدائی کے خیالوں میں تھے جب پانی آگیا..

پہلی تو تیری سیڑھی پر دھوپ ٹھہری ہوئی تھی۔ اس میں ایک چک سی پیدا ہوئی اور پھر ایک مدھم بھاؤ سیڑھیوں سے اترنے لگا۔ ایک نا آشنا سرراہٹ نیچے

اندھیرے میں آئی اور ان کے آس پاس پھیلنے لگی..

”پانی...“ بیگ جہاں تھا وہاں اس نے اپنے بدن کے آس پاس ایک سرد سیال کو بہتے اور گلیا ہٹ کو چھوتے محسوس کیا..

سیڑھیوں پر سے ایک آبشار اتر رہی تھی اور تہہ خانے کو بھر رہی تھی ..

پانی کے ریلے امٹے چلے آتے تھے اور ان کے اندھیرے میں گرتے

تھے ..

عبد الوہاب کی ناک جو غلاظت میں دفن تھی، اس میں پانی داخل ہونے لگا اور اس نے اپنے کو بمشکل اٹھایا ”پانی“ وہ چلایا.. ”واللہ میں بہت پیاسا تھا.. یہ کہاں سے آگیا.. ہماری کربلا میں پانی..“ اس نے بمشکل چند گھونٹ بھرے جو اس کے زخم خورده اور کئے پھٹے اندر وون میں تیزاب کی مانند اسے چیرتے گئے ..

ہاشم میر اپنی نیم مد ہوشی میں تقریباً ڈوب چلا تھا۔ جب اس کے کھلے منہ کے اندر پانی گیا اور سیدھا پھیپھڑوں تک گیا اور وہ بری طرح کھانے لگا..

”یارا دھر بارش ہو رہا ہے..“ گل شیر کے پاؤں کی درازوں میں جب پانی گیا تو وہ آگ کی مانند جلا تھا.. ”اتنا پانی کدھر سے آتا ہے..“

”میرا پونی ڈوب جائے گا۔“ صرف جانی کی آواز میں ایک ڈر تھا اور اس نے گھوڑے کے ڈھانچے کے گرد اپنے بازوؤں کو پھر سے لپیٹ لیا..

پانی جو ان کے آس پاس بہتے تھے، اب پورے تہہ خانے میں پھیلنے کے بعد آہستہ آہستہ اپنی سطح بلند کر رہے تھے..

یہ پانی بہت سرد تھے ..

تحنخ حالت میں برف بن جانے کی نزدیکی میں.. اتنے سرد تھے ..

وہ سبھی اس سرد گلی لپیٹ میں آگر بے اختیار اور بری طرح نکھڑنے

لگے ..

”باہر بارش نہیں ہو رہی..“ پھی پھی کے دانت اس کے بس میں نہ رہے تھے جیسے بر فباری ہو رہی ہوا اور وہ بالکل برہنہ ہو، اسے اتنی سردی محسوس ہو رہی تھی۔ ”وہ جان گئے ہیں کہ ہم یہاں ہیں.. انہیں شک ہو گیا ہے کہ اس تھہ خانے میں کوئی ہو سکتا ہے اور انہوں نے یہ چیک کرنے کے لیے کہ کوئی یہاں ہے یا نہیں پانی چھوڑ دیا ہے.. لیکن یہ نرپانی نہیں، اس میں موت ایسی سردی گھلی ہوئی ہے.. میرے گاؤں کی کسی ندی کا پانی موسم سرماں بھی اتنا خ نہیں ہوتا..“

وہ دیکھ نہیں سکتے تھے، صرف محسوس کر سکتے تھے کہ پانی لحظہ بہ لحظہ اونچا ہو رہا ہے۔ یہاں تک کہ گاؤں کو ڈھانپ کرو ٹخنوں سے اوپر ہو رہا ہے.. اور وہ ایک نیم مردہ وہیل کی مانند اس میں ہولے ہولے اپنے آپ کو بچانے کی خاطر پھرست کتے تھے..

”ادھر اتنا پانی تو نہیں ہوتا یارا..“ گل شیر بھی بری طرح کانپ رہا تھا۔ ”مینکر تو نہیں لے کر آگیا..“

”مینکر...“ ہاشم کی آواز آئی۔ ”بس وہی تھا.. کچھلی رات کچھ دیر کے لیے میرے کانوں میں کسی انجمن کی گھر رکھر کا ہلاکا شور آیا تھا.. میں نے سوچا ہوا ہے اور بہت تیز ہے اور میرے کانوں کو دھو کے میں ڈالتی ہے.. بس وہی تھا..“

”انہوں نے آج نہیں جانا، پہلے سے جانتے ہیں..“

”جانتے ہیں کہ ہم یہاں چھپے بیٹھے ہیں، اس لیے انہوں نے ہمیں باہر نکالنے کے لیے یاڑ بونے کے لیے اتنا ڈھیر پانی چھوڑا ہے..“

”نہیں..“ بیگ بولا۔ ”انہیں صرف شک ہے.. وہ تھہ خانے میں اترنے سے پیشتر تسلی کر لینا چاہتے ہیں کہ یہاں کوئی نہیں.. اگر انہیں ہماری موجودگی کا یقین ہوتا تو وہ اندر گرنیڈیار اکٹ پھینکتے..“

اگر وہ اسی حالت میں پڑے رہتے جس میں وہ تھے تو تھوڑی دیر بعد ہوا کی

بجائے پانی ان کے نہنوں میں جانے لگتا.. انہیں بہر طور اٹھنا تھا.. وہ جیسے بھی اٹھے بار بار گرتے پھر سنبھلتے.. کبھی کھانتے غوطے کھاتے اٹھے اور اٹھ کر بیٹھ گئے.. پانی نہنوں سے بھی بہت اوپر ہوا تھا اور اس کی برف سردی ایک سرد آری کی ماں زد ان کے اتنے حصے کو کاٹ رہی تھی..

”خانہ خراب تو ہمیں برف کر کے مار دے گا.. کیا کرے گا..“

اب نہ کوئی بھوک تھی اور نہ پیاس اور نہ ہی کسی زخم کی ٹیسیں اور نہ کسی کلستر بم کا کوئی آہنی مکڑا یا گولی جوان کے بدن میں بسی ہوئی تھی، بس اس ناگہانی سرد اور گیلی آفت سے بچاؤ کی کوشش تھی..

پانی نہنوں سے بھی اوپر ہونے لگا اور انہیں کھڑے ہو جانے پر مجبور کر دیا.. بہت سمجھے پانی بلند ہوتا رہا.. وہ ایک عرصے سے گھستے رہے تھے.. تھہ خانے کی غلاظت میں رینگتے رہے تھے.. بہت ہوا تو دیوار کے ساتھ ٹیک لگائی لیکن یوں سیدھے اپنے پاؤں پر کم ہی یوں کھڑے ہوئے تھے.. جیسے اب تھے.. اس کے سوا اور کوئی سبیل نہ تھی.. پانی جب کمر تک آیا تو شام ہو رہی تھی..

شام ہوئی تو سیرھیوں پر سے اتری آبشار کے ریلے یکدم تھم گئے..

اتنا پانی انہیں ڈبو دینے کے لیے کافی تھا..

سب کے سب شھرتے ہوئے نیم محمد حالت میں اپنے پاؤں پر کھڑے رہنے.. پانی میں ایستادہ قائم رہنے کی سعی کر رہے تھے اور وہ لرز رہے تھے.. یہ جانتے تھے کہ اگر وہ گرنے تو دوبارہ کھڑے نہیں ہو سکیں گے اور ڈوب جائیں گے..

گل شیر کے دونوں ہاتھ فضائیں بلند کلا شنکوف تھامے ہوئے اکڑ چکے تھے.. ”یارا کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ برف ہو کر مرے گا یا پانی میں ڈوب کر شہید ہو گا..“

”میرا پونی نظر نہیں آرہا.. میری رائیں اس کی پشت کو چھوٹی ہیں اور وہ پانی کے اندر ہے.. ڈوب گیا ہے..“

”ڈوب تو اپنا اللہ بخش بھی گیا ہے جانی اور تم ایک مرے ہوئے گھوڑے کا فکر کرتا ہے.. یہ انگریز لوگ بے شک مومن ہو، جہاد کرے پر اس کی عقل مختلف رہتا ہے.. ادھر ایک مسلمان بھائی میرا پڑا ہے تو اس کا کچھ غم نہیں کہ اس کا لاش پانی میں خراب ہوتا ہے، گھوڑا کا فکر کرتا ہے..“ گل شیر کے لبھے میں سرد تلخی تھی..

”چلو اچھا ہے کہ گھوڑے کا گوشت نرم ہو رہا ہے خال صاحب..“ بیگ نے اس کی تلخی کو محسوس کرتے ہوئے کہا اور اپنے آپ میں مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہم یہاں اس پانی میں زیادہ دیر کھڑے نہیں رہ سکتے۔“ وہاب بولا۔

”اگر ہم ذرا ہمت کر کے آہستہ آہستہ چلتے سیرھیوں پر جائیں تو..“

”سیرھیاں کتنی باقی رہ گئی ہیں.. اور اوپر پانی سے بلند ان سیرھیوں پر بیٹھے

ہوئے ہم ان کو صاف نظر آجائیں گے اور بطنوں کی طرح مارے جائیں گے۔“

”یار بطنیں اتنے سرد پانی میں کیسے رہ لیتی ہیں..“

”کسی بطن سے پوچھ کر بتاؤ گا..“ یہ فقرہ اس قسم کی صورت حال میں

صرف بیگ ہی کہہ سکتا تھا.. اور اسی نے کہا..

”ویسے نا ہے کہ چار بطنوں کا خوشی سے کوئی تعلق نہیں.. کیا یہ سچ

ہے؟“

”کیا وہی تباہی بک رہے ہو ہاشم..“ بیگ اس کی ذہنی حالت کی ابتری پر

فکر مند ہو گیا۔ ”نه یہاں بطنیں ہیں اور نہ کوئی خوشی.. اور نہ کوئی سچ..“

اگر اس تاریکی میں کوئی چراغ جلاتا تو اس کی جھمل میں اسے کمر تک پانی

میں ڈوبے چند ہیو لے نظر آتے جن میں سے تین اپنے ہاتھ بلند کئے ہوتے، اپنے

ہتھیار بچانے کی خاطر اور بقیہ تین اپنی بغلوں میں ہاتھ دیئے ٹھہرتے اکثر تے دکھائی دیتے اور یہ چھ نیلے چہروں اور نیلے بدن والے ہوتے کہ پانیوں کی بر فیلی خصلت نے ان کی رنگتیں نچوڑ کر ان میں نیل بھر دیا تھا... ان کا تن من نیلو نیل کر دیا تھا..

شام کے سری نقش پاپرا پنے سیاہ پاؤں دھرتی رات آچکی تھی ...

پانی کے قیدی اپنے آپ کو سنبھالنے پر سنبھلانہ جاتا تھا ..

تب ایک دھڑام کی .. ایک شڑاپ کی آواز آئی جیسے دریا کا ریتلہ کنارا گئی شب یکدم پانی میں گرتا ہے تو ایک عجیب اداس اور المناک آواز آتی ہے .. اور پھرچی چی کھانے لگا ..

وہ گر گیا تھا .. اور ایک ڈوبتے شخص کی مانند بے تحاشا ہاتھ پاؤں مارتا، پھر سے کھڑا ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا .. اس کے خوف نے اس کی مدد کی تھی ورنہ وہ اس قابل نہ تھا .. اور جان گیا تھا کہ اپنے کانپتے ٹھہرتے نیلے بدن کے زخموں کی نقاہت اور بھوک کے ساتھ اگر ایک مرتبہ پھر گراتو دوبارہ اٹھ نہیں سکے گا ..

وہاں مخدوم ہوتے اور اس کے باوجود ٹھہرتے کانپتے ہاشم میر کی کمر کے گرد ... پانی کے اندر سے ایک ہاتھ آیا اور وہ شدید ڈر میں آکر زیادہ کانپنے لگا کہ یہ کون ہے اور کیا ہے .. اس ہاتھ کی انگلیاں اس کی کمر کے گرد لپٹ رہی تھیں .. اس نے اپنا ایک ہاتھ بغل میں سے نکالا اور پانی میں ڈبو کر اپنی کمر کو ٹوٹا تو ایک ہاتھ جیسے اس سے مصافحہ کرنے کی غرض سے اس کے ہاتھ میں آگیا .. اس ہاتھ کی انگلیاں نرم اور بے جان تھیں کہ اللہ بخش کی لاش پھول کرا بھر آئی تھی ...

تیرتی ہوئی ہاشم تک آگئی تھی ...

اور اس سے ہاتھ ملانا چاہتی تھی ..

ہاشم ٹھٹک کر اور ڈر میں گرفتہ اس سے پرے ہوا .. اسے ذرا دھکیلا تو وہ

ڈوہتی ابھرتی بیگ کے جُنے سے جا نکل رائی..

”یہ تم ہو ہا شم؟“

”نہیں.. یہ اللہ بخش ہے۔“

”وہ تو مر نہیں گیا تھیا را..“ گل شیر چونکا..

”اس کی لاش پانیوں میں تیر نے لگی ہے.. ذرا انتظار کرو خان صاحب..“

ابھی تم تک بھی آجائے گی..“

”کیا بے حرمتی ہے یارا.. ہمارا مسلمان بھائی کا لاش بے گور و کفن ادھر پانی میں تیرتا پھرتا ہے.. بے شک یہ تھہ خانہ کا خانہ بر باد ہو جائے، پر صحیح اس بھائی کو اٹھا کر اوپر قلعہ جنگل کے صحن میں ڈال آئے گا۔“

”صحیح تک ہم مر چکے ہوں گے..“

”آگیا ہے یارا آگیا ہے..“ گل شیر کو جیسے پھڑایا رمل گیا ہو۔ ”ادھر آگیا ہے ہمارا بھائی.. میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ہے اور اسے ادھر ادھر جخل خوار نہیں ہونے دوں گا.. میرا انگلی میں اپنا انگلی ایسے پھنساتا ہے جیسے زندہ ہو..“

”وہ زندہ نہیں، ہم مردہ ہو چکے ہیں..“

کچھ دیر خاموشی رہی.. پانی کی ٹھنڈک میں بتدرنج اضافہ ہوتا رہا.. اور اس تناسب سے ان کے بدن مزید سرد ہوتے رہے..

”یار اللہ بخش کو میں چھوڑتا ہوں۔ ایک ہاتھ میں ہتھیار اوپر کیا ہوا ہے اور دوسرا ہاتھ سے اس کو پکڑا ہے تو مشکل ہو رہا ہے.. وہاب بھائی آپ بیکار کھڑا ہے، بغلوں میں ہاتھ دے کر تو تم اسے سنہمال لو یارا..“

”بھیج دو ادھر..“

گل شیر نے اللہ بخش کی لاش کو نہایت پیار سے.. جیسے نیچے کو تھکی دیتے ہیں.. اس سمت دھکیلا جدھر سے وہاب بولا تھا..

وہ.. اللہ بخش پانی میں تیرتے ایک ٹھنڈے شہتیر کی مانند اس کی کمر سے جا

لگا..

وہاب نے پانی میں ٹھوٹ کراس کا ایک ہاتھ دریافت کیا اور تھام لیا..

اوپر مکمل سکوت تھا..

کوئی بھی نہ تھا..

پانی چھوڑنے والے بھی نہیں تھے..

وہ مزار شریف کو واپس جا چکے تھے، اپنے اپنے گھروں کی چوکھت کے اندر جہاں آتش دانوں میں آگ جلتی تھی..

اگر ان میں سے کوئی ایک ابھی تک اوپر تھا.. اور تمہے خانے کے باہر شست لگائے تاک میں بیٹھا تھا تو وہ بھی شامد سوچ کا تھا۔ اس اطمینان کے ساتھ کہ اول تو اتنے روز تک بغیر خوراک کے کسی ذی روح کا زندہ بچنا ممکن نہ تھا اور اگر کوئی ایسا بچا کھچا ڈھیٹ رہ بھی گیا تھا تو وہ کب کا پانیوں کے اس ریلے میں ڈوب چکا ہو گا۔ اگر زندہ ہوتا تو وہاں دیتا باہر نہ آ جاتا..

وقت گزر رہا تھا..

وہ مر چکے تھے یا زندہ تھے، کون جانتا تھا، سوائے اس کے جوان کی شہرگ سے بھی قریب تھا.. وہ جانتا تھا کہ ان کی نبضیں چل رہی ہیں.. کہ وہی انہیں چلا رہا تھا..

تاریکیوں کے سمندر میں چھ جزیرے ابھرے ہوئے تھے اور ساکت تھے..

گھوڑے کا ڈھانچہ کبھی جزیرہ بنتا تھا لیعنی سطح آب پر نمودار ہوتا تھا اور کبھی ڈوب جاتا تھا اور اللہ بخش تھا جسے وہاب نے تھام رکھا تھا اور وہ بھی ڈوبتا ابھرتا رہتا تھا.. چھ جو گی تھے جو اس تاریک گپھا میں ڈھونی رمائے کھڑے تھے.. ان کا نیٹھرنا اور کانپنا بھی موقف ہو چکا تھا اور وہ سردی میں نیلوں میں ہوئے ساکت

اور محمد سے ہو چکے تھے ..  
رات ہو چکی تھی ..

چاندنی .. مکر چاندنی کی بناؤث اور اس کا دھوکا سیڑھیوں پر بر جمان ان کو  
دیکھتا تھا .. شائد آخری بار دیکھتا تھا ..  
رات کا کوئی پہر تھا ..

کونسا پہر تھا، اس کا ریکارڈ صرف ملک الموت کے رجسٹر اندر اج میں  
تھا ... نہ صرف پہر بلکہ وہ ساعت، وہ گھنٹی بھی درج تھی اور اس ساعت  
عبدالواہب کی ٹھُل ہمت ... ساری سکت اس کی خوبستہ ہڈیوں اور زخموں اور بھوک  
کو یکدم خالی کر گئی .. ہر انسان چاہے وہ ایک تصور کامل پر کتنا ہی یقین کیوں نہ رکھتا  
ہو، کیبھر ج کا تعلیم یافتہ کیوں نہ ہو .. ابو نواس اور امراء القیس کی شاعری کا کتنا ہی  
دلدادہ کیوں نہ ہو ... بالآخر ڈھے جاتا ہے ..

وہ .. عبد الوہاب اب بھی کھڑا تھا .. اور ابھی پانی میں گر گیا ..  
اس نے کوئی تنگ و دونہ کی .. شائد وہ اس خوبستہ بھوکی ایجادگی میں ہی  
مر چکا تھا اور اب جا کر اس ساعت میں جو ملک الموت کے رجسٹر میں درج تھی ...  
وہ پانی میں گرا تھا ..

اس نے کوئی تنگ و دونہ کی .. ہاتھ پاؤں نہ مارے، ایک محمد پھر کی مانند  
پانی میں ڈھے گیا .. اور پھر نہیں ابھرا .. اور اتنی آہستگی سے گرا کہ پانیوں کو بھی خبر  
نہ ہوئی کہ کوئی ان میں گرا ہے ..

پانیوں کو تو کیا اس کے ساتھیوں کو بھی خبر نہ ہوئی کہ وہ اب ان میں  
نہیں ہے ..

وہی رات تھی .. مسلسل تھی ..

اسی رات کا ایک اور پہر تھا ..

سویر کی نزدیکی میں کوئی پھر تھا..  
 اور یہ پھر.. اور یہ ساعت بھی کہیں درج تھی ..  
 فیصلہ ہو چکا تھا کہ پھر کو نسا ہو گا... کوئی ساعت ہو گی.. جب ابوطالب  
 کا جما ہوا وجود، بہت آہنگ سے... ایک ڈوبتی کشتی کی مانند دھیرے پانی  
 میں غائب ہو گیا.. یہ وجود کبھی کیسے قیاس کر سکتا تھا کہ اس کی قبر پر عقاب پرواز  
 نہیں کریں گے اور وہ کسی جھرنے، کسی چٹان کی گود میں دفن نہیں ہو گا.. اسے پانی  
 کی موت آئے گی..

اس جزیرے کے ڈوبنے کا احساس بھی کسی اور ساتھی جزیرے کو نہ ہوا  
 کہ وہ بھی خاموشی سے پانی میں اتر گیا تھا..

جو کھڑے تھے، وہ بول نہ سکتے تھے۔ بولنے کی سعی کرتے تو ان کے  
 دانت کٹکٹانا نہ لگتے اور ان کے ہونٹ کٹتے تھے۔ انہیں علم ہی نہ ہوا کہ اب وہ  
 صرف چار ہیں۔

سویر ہوئی ..

ایک اور سویر ہوئی ..

اور جب وہ سویر ہوئی .. دھوپ پہلی سیرھی پر آئی تو وہ سیرھی ابھی تک  
 گیلی تھی تو اس نے .. دھوپ نے .. نیچے تہہ خانے کی تاریکی میں جھانکا تو وہاں پانی  
 پر تین ایسی کشتیاں تھیں جو بھول کر ابھر چکی تھیں اور ڈیکتی ابھرتی تیرتی تھیں ..  
 گل شیر کے بر فیلے پتھر پوٹے کھلے تو تیسرا سیرھی پر اتر چکی دھوپ کی  
 ہلکی روشنائی میں اس نے ان تینوں کو اپنے آس پاس تباہ شدہ جہاز کے تختوں کی مانند  
 پانی پر تیرتے دیکھا.. اس کی انگلیاں لمبی پر جم چکی تھیں .. اس کے لوہے کے  
 ساتھ چمٹ چکی تھیں ... اس نے کوشش کی کہ وہ انہیں وہاں سے الگ کر کے ان  
 تینوں کو نہ سہی، پچھی اور وہاں کو ذرا اٹھوں کر دیکھئے تو سہی کہ ان میں کہیں زندگی

کی کوئی رقم موجود ہے کہ نہیں.. کہیں وہ شغل کے طور پر تو یونہی ڈوبتے ابھرتے موج میلہ نہیں کر رہے اور وہ انہیں مردہ سمجھ بیٹھا ہو.. اس نے کوشش کی.. لبپی پر چمٹی ہوئی انگلی کو الگ کرنے کے لیے اسے جھنکا دیا تو وہ.. لبپی.. دب گئی..

تہہ خانے کے اندر وون میں اتنے زور کا دھماکا ہوا کہ وہ تین لاشیں بھی ایک لمحے کے لیے ٹھنک سی گئیں.. گھوڑے کی تھوڑنی پانی سے یکدم ابھر آئی.. اور اگر اس میں جان ہوتی تو وہ یقیناً اس یکدم دھماکے سے خوفزدہ ہو کر بہنہتا۔

دھماکے کی گونج تادیر پانی کی سطح اور تہہ خانے کی چھت کے بو سیدہ شہتیروں کے درمیان بھکلتی رہی.. بھکلتی ہوئی تہہ خانے میں سے سیڑھیاں طے کرتی اور پر گئی اور قلعہ جنگی کے صحن میں پہلی دھوپ میں اکڑتے مسخ شدہ بُو دیتے، گلتے سڑتے پیکروں پر سے گزرتی ہو سکتا ہے کہ مزار شریف تک چلی گئی ہو۔ یہ اعلان کرتی کہ ”کوئی ہے.. کوئی ہے..“

کون ہے؟

اس تہہ خانے میں کوئی ہے..

جہاں کسی کا ہونا ممکن نہ تھا، وہاں کوئی ہے..

اس ناگہانی اور یکاخت دھماکے نے جہاں کئی روز کی مکمل خاموشی کی دھیاں بکھر دیں وہاں ہاشم میر.. مرتضی بیگ، گل شیر اور جانی واکر کے محمد شدہ تقریباً مر چکے اجسام پر بھی اثر کیا اور وہ پانی میں کھڑے کھڑے یکدم اپنے زندہ ہونے کے احساس سے جا گلکرائے..

”اوے نامراد پٹھان..“ بیگ اس محمد ناتوانی میں جتنا بھی چیخ سکتا تھا، ایک بیٹھی ہوئی سرگوشی میں چیخا ”یہ تم نے کیا کیا خاتاں.. فائز کر دیا..“

”نہیں..“ گل شیر کی آواز مردہ تھی۔ ”یارا جان بوجھ کر نہیں کیا.. انگلی

لبی پر چھٹ گیا تھا.. الگ کرنے کی کوشش میں دب گیا.. تو یارا یہ فائز میں نے نہیں.. تقدیر نے کیا ہے.. فنا نے میرا انگلی زبردستی دبایا ہے۔ میں نے نہیں دبایا.. تم قسم لے لو۔“

”اب وہ جان جائیں گے کہ یہاں ہم ہیں.. اور زندہ ہیں۔“

”تو اچھا ہے یارا.. جان جائیں.. یہ تماشا تو ختم ہو.. یہ مداری کا تماشہ ختم ہو جائے تو اچھا نہیں ہے.. خواہ مخواہ ادھر پانی کی قید میں برف کا جزیرہ بنتا ہے تو بہتر نہیں ہے کہ تماشہ ختم ہو اور وہ جان جائیں کہ ہم یہاں ہے...“

ان میں جتنا بھی دم تھا اسے سادھے ہوئے وہ چپ کھڑے رہے اور پھر کچھ ساعتوں کے گزرنے پر جانی کی پُر مسرت آواز آئی۔ ”مجھے لگتا ہے میرا پونی بھی پھول کر اب پانی پر تیرنے لگے گا... میں اس کو تھک سکوں گا۔“

”شٹ اپ جانی..“ مرتضیٰ بیگ بیٹھی ہوئی آواز میں بولا..

پانی پر ابھی تک تین لاٹھیں، چند ڈرم اور کارٹن تیر رہے تھے۔ ان کے درمیان گھوڑے کا سرا بھرنے لگا..

گل شیر کے فائز کے دھماکے کی آواز اگرچہ تہہ خانے میں سے نکل کر مزار شریف تک مار کر چکی تھی اور شاید لبخ کے ہندروں میں برا جمان پارسی بوڑھے کی آگ کو ذرا تھرہ ریا بھی تھا لیکن اس کا کچھ حصہ ابھی تک تہہ خانے کے اندر گونج رہا تھا..

”یہ.. یہ بھی ممکن ہے.. کہ کسی نے اس فائز کو نہ سنایا ہو.. باہر ان دونوں اتنے فائز ہوتے رہتے ہیں اور ان میں ایک اور فائز شاید کسی نے نہ سنایا ہو۔“

”نہیں ہاشم میر.. یہ ایک فائز بھی ان سنائیں جا سکتا کیونکہ وہ اسی ایک فائز کے منظراً ہیں اور اس کی آواز میں ان کی مکمل فتح پہنچا ہے تو وہ اسے سن چکے ہیں۔“

”ابھی تک تو کچھ نہیں ہوا.. اوپر کوئی بھی نہیں، قدموں کی چاپ بھی  
نہیں۔“

”پہلے تو انہیں شک تھا، اب یقین ہو گیا ہو گا۔ اس لیے وہ باتیں کرتے،  
سیر کرتے نہیں خاموشی سے دبے پاؤں آئیں گے.. چاپ نہیں سنائی دے گی۔“  
انہوں نے اللہ بخش کا ماتم تو بہت کیا تھا کیونکہ وہ پہلی موت تھی لیکن  
وہاب اور ابوطالب کے رخصت ہونے پر وہ آبدیدہ بھی نہ ہوئے کہ ان کے آنسو  
برف ہو چکے تھے.. وہ خود مردہ ہو چکے تھے اور صرف فارم کی آواز نے انہیں ایک  
بار پھر زندگی میں دھکیل دیا تھا.. وہ دونوں ان کے آس پاس تھے، ڈوبتے ابھرتے۔  
کبھی ان کے پانی میں غرق بدنوں کے کسی حصے سے چھوتے.. لیکن اس کے باوجود  
انہوں نے ان دونوں کا سوگ نہ منایا کہ وہ اس حقیقت کو قبول کر چکے تھے کہ بس  
یہی ہونا تھا بلکہ ان کے لیے بہتر ہوا کہ وہ یوں چپکے سے پانی میں ڈھنے کر آزاد ہو  
گئے۔

ان چاروں کے بچے کچھ زخم خورده نیلے پڑ چکے، بدن اب انسانی ضرورتوں  
اور حیات سے ماوراء ہو چکے تھے.. کیونکہ وہ انسان نہیں رہے تھے.. نہ کہیں بھوک  
تھی اور نہ پیاس، نہ ہی کوئی اذیت یا سردی کا احساس.. وہ کمر تک آئے سرداپانی میں  
بُت بنے بغیر کسی کوشش یا تردد کے.. پھر ہو چکے تھے..  
دوپہر ہو گئی..

اوپر ابھی تک خاموشی تھی..

کوئی نہ تھا..

البته گلتی سڑتی لاشوں پر سے جو ہوا سرسراتی گزرتی تھی اس کی ہلکی سی  
آواز سیدھیوں سے اتر کر پانیوں پر تیر جاتی تھی اور اس کے سوا اوپر کوئی نہ تھا..  
دوپہر ہو گئی..

پھر ڈھلنے لگی..

پانی میں ایستادہ بُت نہ کسی دو پھر میں تھے اور نہ کسی رات میں .. وہ سناٹے کے کسی موسم میں گم بے جا تھے ..  
دھوپ اٹھنے لگی ..

تیسرا سیرھی سے اٹھ کر دھوپ پہلی سیرھی پر جا تھہری .. کسی ایک گھری، کسی ایک ساعت ... جب وہ چاروں ایک دوسرے کے وجود سے بھی نا آشنا تھے، سناٹے کے کسی موسم میں گم تھے۔ اتنے کہ اگر اس لمحے ان کے سامنے ان کا کوئی عزیز .. ایک ماں .. یا باپ بھی آکھڑا ہوتا تو انہیں احساس تک نہ ہوتا اور نہ وہ اسے دیکھتے تب کسی ایک گھری .. کسی ایک ساعت میں .. پہلی سیرھی پر دو بوٹ آئے اور ایک سایہ پڑا اور پھر اس کے ہاتھوں میں سے ایک آتشیں وجود نکلا اور تہہ خانے کے اندر پل بھر کے لیے اتنی چکا چوند روشنی ہوئی جیسے کوئی بارات آگئی ہو اور پھر ہر شے کو پھاڑ دینے والا ایک دھماکہ اس روشنی کے بجھتے ہی بلند ہوا .. اس آتشیں وجود نے پانیوں کو ادھیر ڈالا .. ان کے اندر گھوڑے کے ڈھانچے کے پرخچے اڑا دیئے اور اس کی تھوڑنی اس سے الگ ہو کر کچھ دیر کے لیے فضائی معلق ہوئی اور پھر پانی میں گر گئی ..

جانی نے جیسے کچھ بھی نہ سنا ہو .. اس کے سامنے سینکڑوں شرارے سے چھوٹے لیکن اس نے انہیں بھی نہ دیکھا ہو .. اس نے صرف گھوڑے کی تھوڑنی کو بقیہ ڈھانچے سے الگ ہو کر اپنے قریب گرتے دیکھا اور اسے تھپک کر بولا ”پونی...“

پہلے کے فوراً بعد دوسرا آتشیں وجود فائز ہوا ..

یہ راکٹ و قلعے پر یقین نہ رکھتے تھے .. جیسے پانی ایک آبشار کی صورت اترے تھے بنا کسی وقفے کے .. ایسے یہ آتشیں وجود تہہ خانے کے مختصر وجود میں